ایک نازک ترین مسئلہ اور اس کے تقاضے

مولانا محمد اسماعیل ریحان

اہل علم کے حلقوں میں دینی مدارس میں عصری علوم کی ترویج کا مسئلہ ایک عرصے سے زیر بحث ہے اور اس سلسلے میں بہت کچھ کہا اور سنا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں راقم اہل علم و دانش کے تجربات و آراء کی روشنی کے ساتھ اپنے ذاتی مشاہدے کے تحت چند باتیں کرنا چاہتا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب میں عصری علوم کی شمولیت کی اس کوشش سے قطع نظر جو اہل مغرب اور مغرب نواز حکومتوں کی جانب سے کی جاتی رہی ہے، اس وقت ہمارا موضوع سخن وہ ضرورت ہے جسے خود اہل مدارس اپنے اہداف کی تکمیل کے لئے محسوس کرتے ہیں۔

یہ بات تو اب خارج از بحث ہو چکی ہے کہ مدارس میں بقدر ضرورت عصری علوم پڑھائے جائیں یا نہیں، کیوں کہ وفاق المدارس کے طے کردہ نصاب میں اعدادیہ کے تین سالوں کے دوران آٹھویں تک سرکاری نصاب کے مطابق اردو، ریاضی، انگریزی، سائنس اور معاشرتی علوم کے مضامین لازمی طور پر پڑھائے جا رہے ہیں، یعنی تقریباً ہر مدرسے میں اس حد تک عصری علوم داخلِ نصاب ہیں۔

لہٰذا اصل سوال اب یہ ہے کہ اس حد تک عصری علوم ایک فاضلِ مدرسہ کی ضروریات پوری کرتے ہیں یا نہیں؟ ان ضروریات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک کا تعلق فارغ التحصیل علماء کی اپنی ذات سے ہے جیسے ضروری کاغذات کا پڑھنا، بل چیک کرنا، کسی فارم پر دستخط کرنے سے قبل اس کے مندرجات سے آگاہ ہونا، مختلف اداروں کے اشتہارات، سائن بورڈز اور اعلانات اور ہدایات کو سمجھ سکنا، اپنے شعبے اور فن میں کمپیوٹر سے بوقت ضرورت استفادہ کرنا، عام حساب کتاب سے واقف ہونا وغیرہ۔

دوسری ضروریات وہ ہیں جن کا تعلق ایک فاضل مدرسہ کے مقاصد و اہداف اور فرائض منصبی سے ہے۔ مثلاً زیادہ سے زیادہ لوگوں تک دین کی دعوت و تبلیغ، افتاء و ارشاد، درس و تدریس، تحریر و تصنیف، صحافت، تاریخ و ادب، ردِ فتن اور تقابل ادیان کے لئے مختلف زبانوں میں لٹریچر کا مطالعہ اور معلومات کے زیادہ سے زیادہ ذخائر تک

دسترس وغیرہ۔

ان دونوں قسم کی ضرورتوں سے تقریباً ہر فاضل مدرسہ کو واسطہ پڑتا ہے۔ اپنے ماحول کے لحاظ سے بعض کو کم بعض کو زیادہ۔ یہ درست ہے کہ ایسے حضرات بھی ہیں جو ایسے مسائل کی زد سے محفوظ ہیں۔ علوم عصریہ سے ان کی ناواقفیت ان کی اعلیٰ دینی خدمات میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتی ہے نہ ذاتی ضروریات وحاجات میں۔ مگر ایسے حضرات کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

اس ضمن میں راقم دو نظائر پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ حضرات جو اپنے مخصوص ماحول کی بناء پر مدارس میں عصری علوم کے موجودہ معیار کو کافی سمجھتے ہیں، دوسرے ماحول کی جھلک واضح طور پر دیکھ لیں۔

(۱) محفل گرم تھی، بات گھوم پھر کر مدارس میں عصری علوم کی ضرورت پر آچکی تھی، ایک شریک محفل کہنے لگے: ''برسوں پہلے کا ذکر ہے مجھے تار گھر جا کر اہل خانہ کو اطلاع دینی تھی کہ میں ٹرین سے کل پانچ بجے گھر آرہا ہوں۔ تار دینے کا یہ پہلا موقع تھا، تار بابو نے پیغام لکھنے کے لئے پرچی دی تو میں اردو میں لکھنے لگا۔ وہ جھلا کر بولا: ''تار اردو میں نہیں، انگریزی میں دیا جاتا ہے''۔ مگر میں انگریزی نہیں جانتا۔ اچھا! تو سامنے پان سگریٹ والے کی دکان پر جائیں، جو صاحب وہاں بیٹھے ہیں، وہ پندرہ بیس روپے لے کر آپ کو تار لکھ دیں گے''۔ میں پان سگریٹ والے کے پاس گیا۔ اس نے انگریزی میں دو جملے لکھ دیئے، میں نے اسے بیس روپے تھمائے اور تار گھر سے تار دیا۔ باہر نکل کر میں مسلسل سوچتا رہا کہ اس علم وفضل کے باوجود کیا مدرسے کی حدود سے باہر میں ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بھی لوگوں کی راہنمائی کا محتاج رہوں گا''۔ یہ وہ واقعہ تھا جس نے عصری علوم سے بے گانگی کی بابت میرا سابقہ نظریہ بدل ڈالا اور پہلی بار میں نے انگریزی پڑھنے کی ضرورت سنجیدگی سے محسوس کی۔

مذکورہ واقعہ دینی مدارس کے ہزاروں فضلاء میں سے ایک فاضل کا ہے جو علوم دینیہ میں رسوخ حاصل کر لینے اور اپنے اساتذہ سے سندِ امتیاز پانے کے باوجود آخر کار ایک دن یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ عصری علوم کے ضروری ادراک کے بغیر وہ عام زندگی میں قدم قدم پر سخت پریشانی کا شکار ہوتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کے مسائل سے کسی کو مفر نہیں۔ لہٰذا اس کی ضروریات سے آنکھیں موند کر خود ساختہ حدود میں ہو جانا کوئی عقل ودانش کی بات نہیں، خصوصاً اس شخص کے لئے جو دنیا میں کوئی بڑا کام کرنے کا عزم بھی رکھتا ہو۔

(۲) اس سے زیادہ قابلِ توجہ واقعہ وہ ہے جو ممتاز عالم دین، محقق اور معروف صحافی مفتی ابولبابہ نے اپنے ایک کالم میں ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مفتی صاحب کے ایک ہونہار شاگرد فراغت کے بعد کسی علاقے میں امامت، خطابت اور درسِ قرآن کے ذریعے لوگوں میں دعوتِ دین کا کام کرنے لگے، لیکن کچھ عرصے بعد انہیں محسوس

ہوا کہ جب عوام خصوصاً نوجوان لڑکے ان سے کسی مسئلے کی وضاحت کے لئے سوالات کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کے بہت سے الفاظ انگریزی ہونے کی وجہ سے ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب سوال ہی پوری طرح سمجھ نہ آئے تو جواب کس طرح درست دیا جاسکتا ہے۔ الغرض ان شاگرد رشید نے اپنے محترم استاد مفتی صاحب کو خط لکھ کر اس پریشانی کا اظہار کیا اور اس کا حل تجویز کرنے کی درخواست کی۔ مفتی صاحب نے وہ خط من وعن اپنے کالم میں نقل کر دیا اور اس کے جواب میں علماء دین کے لئے عصری علوم میں سے انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم کو اس حد تک سیکھنے پر زور دیا جس سے انگریزی بول چال کا ادراک ہو سکے اور معلومات کے انگریزی میں دستیاب ذخائر کسی فاضلِ مدرسہ کی دسترس سے باہر نہ رہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مثالیں ان اَن گنت واقعات کی ایک جھلک ہیں جو کہ دینی مدارس کے اکثر فضلاء کو پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اپنی ذاتی ضروریات اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے انگریزی اور عصری علوم میں ضروری دسترس ایک فاضلِ مدرسہ کے لئے ضرورت کی چیز بن چکی ہے۔

بہرکیف ماحول کے فرق کی وجہ سے اس مسئلے پر دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ علوم دینیہ کے ساتھ عصری علوم کی موجودہ مقدار کافی ہے اور دوسری یہ کہ ناکافی ہے..... جو حضرات مستقل طور پر مدارس کی حدود میں رہ کر درس وتدریس میں منہمک ہیں، انہیں عصری علوم کی موجودہ آمیزش کافی معلوم ہوتی ہے جب کہ وہ حضرات جو دینی اداروں کے انتظامات، دعوت وتبلیغ، جدید موضوعات پر تصنیف وتالیف اور صحافت جیسے شعبوں سے منسلک ہیں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ عصری علوم کے تناسب اور طلبہ میں اس کی استعداد میں معقول اضافہ ناگزیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ وسیع دائرے میں کام کرنے والوں کو اسی تناسب سے عصری علوم کے حصول کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے اور وہ قدم قدم پر ان سے مدد لینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس پہلو کو دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ عام ضرورت کی دنیوی معلومات اور عصری علوم سے نسبتاً زیادہ واقفیت رکھنے والے زیادہ وسیع دائرے میں کام کر سکتے ہیں جب کہ ان علوم میں کم دسترس رکھنے والے اسی تناسب سے محدود کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس بات کو ہم ایک اور انداز سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جدید وسائل استعمال کرنے والے اپنا کام زیادہ تیزی سے جما اور پھیلا سکتے ہیں، جب کہ اگر کوئی ادارہ ان جدید وسائل سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے موبائل اور ای میل کے دور میں اپنے مواصلاتی ذرائع صرف ڈاک کے قدیم نظام پر منحصر کئے رکھے تو یقیناً جو کام دنیا ایک دن میں کر رہی ہے، وہ ایک ماہ میں کر پائے گا اور اس کا کام بالکل پس منظر میں چلا جائے گا۔ عصری علوم کی حیثیت بھی

ایک قسم کے مواصلاتی ذرائع کی ہے۔ یہ خود مقصود نہیں مگر قرآن وحدیث اور فقہ کے مقصود علوم یعنی علوم عالیہ کے ابلاغ کا ذریعہ ضرور ہیں۔ ان سے بے اعتنائی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے گودام مال سے بھرے ہوں مگر پبلسٹی اور مواصلات کے جدید ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جہاں جہاں ضرورت ہے وہاں کھپت نہ ہو سکے۔

حاصل مطلب یہ ہوا کہ کم وقت میں زیادہ وسیع دائرے میں کام عصری علوم میں بہتر استعداد پر موقوف ہو چکا ہے اور زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہو چکا ہے کہ ہم اس ''موقوف علیہ'' کی بھرپور تیاری کریں۔ یہ درست ہے کہ ایک مخصوص نہج پر کام کرنے والے حضرات اس ضرورت کو محسوس نہیں کر سکتے مگر چونکہ مسئلہ ایک دو شعبوں کا نہیں بلکہ تمام ان شعبوں کا ہے جہاں فضلائے مدارس کی کھپت ہے، اس لئے اس ضمن میں بہرحال وسعت نظری سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس اپنے موجودہ نصاب اور نظام کے ساتھ مدرس، خطیب، ائمہ، حفاظ و قراء، محدث، مفتی اور مشائخ پیدا کر رہے ہیں اور ان کا موجودہ نصاب اس کے لئے کافی ہے۔ یہ بھی شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ مدارس کا اصل وزن وراہمیت انہی شعبوں کو زندہ کرنے، قائم رکھنے اور ان کے لئے رجال کار مہیا کرنے کے سبب ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یقینی ہے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، نئے حالات نئے تقاضوں کے ساتھ ہمارے سامنے آرہے ہیں اور وہ ہم سے کچھ ایسی تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہے ہیں جن سے دین کے ان تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کے امتزاج کی بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے، جس سے مطلوبہ مقاصد پورے ہو سکیں۔ اس سلسلے میں دو شکلیں ہمارے سامنے ہیں:

(۱) ایک شکل تو یہ ہے کہ امتزاج کا یہ کام دینی مدارس ہی کے موجودہ نظام کے اندر ہو، الگ سے ادارے نہ بنائے جائیں۔ اس کی پھر کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ درجات اعدادیہ میں عصری علوم کا ''لیول'' بڑھا دیا جائے، اس ترتیب کے تحت بعض مدارس میں درجہ اولیٰ میں داخلے سے قبل میٹرک کی شرط عائد کر دی گئی ہے۔ بعض مدارس میں اعدادیہ کے ساتھ یا اعدادیہ کے بعد طلبہ کو مدرسے ہی کے تحت میٹرک کے نصاب کی تیاری کرا کے امتحان دلوایا جاتا ہے۔ دارالعلوم کراچی اور جامعۃ الرشید میں اس ترتیب کو اپنا لیا گیا ہے۔ یہ صورت اس حد تک کامیاب ہے کہ طلبہ عصری مضامین میں نسبتاً کچھ بہتر صلاحیت کے حامل ہو جاتے ہیں مگر اس سے مطلوبہ ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں کیونکہ مڈل اور میٹرک لیول میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ تاہم اس طرح طلبہ کو ایک بہتر بنیاد ضرور مل جاتی ہے۔ ایک اور ترتیب جس کی بعض مدارس میں سفارش کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ صرف انگریزی کو اولیٰ سے خامسہ تک مستقل مضمون کی حیثیت دے کر اتنی توجہ سے پڑھایا جائے کہ عربی کی طرح اس کی بہترین استعداد حاصل

ہوجائے۔ اس کے ساتھ اگر کمپیوٹر سے بھی واقف کرادیا جائے تو ایک فاضل مدرسہ، عصری علوم کی باقی معلومات ازخود دستیاب ذخائر اور لٹریچر سے حاصل کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے منطق وفلسفہ میں مزید تخفیف کرکے وقت نکالا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے ادارے تشکیل دیئے جائیں جو دینی مدارس کے نظام سے ہٹ کر مگران مدارس کے اکابر کی مشاورت سے کام کریں اور دینی وعصری علوم کی اعلیٰ استعداد رکھنے والے افراد تیار کرکے ضروری محاذوں پر ان کی کھپت کریں۔ اس سلسلے کی دو بنیادی ترتیبیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ طلبہ کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ شروع سے عصری علوم سکھائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور اس سلسلے میں کئی تجربات ناکامی کا شکار ہوچکے ہیں مگر اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں۔ اس کی ایک عملی مثال موجود ہے جس کا تذکرہ میں آگے کروں گا۔

(ب) دوسری ترتیب یہ ہے کہ عصری علوم میں بہترین استعداد کے حامل افراد کو دینی علوم کے لئے تیار کیا جائے اور انہیں عالم دین بنا کر کم وقت میں زیادہ نتائج حاصل کئے جائیں۔ یہ کام بھی از حد دشوار ہے، خصوصاً اس لئے کہ اس لیول کے لوگوں کا خود کو دین کے لئے فارغ کرنا اور پھر استقامت سے اس پر جمے رہنا آسان کام نہیں۔ تاہم یہ صورت بھی ناممکن نہیں رہی کیوں کہ اس کا عملی نمونہ بھی سامنے آچکا ہے۔

مذکورہ بالا تمام بحث کا حاصل یہ نکلا کہ مدارس میں علوم عصریہ کی ضرورت، کل کی بنسبت آج خاصی بڑھ چکی ہے۔ اس لحاظ سے مدارس میں اس کی ترتیب تبدیل کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو روز بروز کھل کر سامنے آرہی ہے اور جو حضرات کچھ عرصہ پہلے اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور وفکر کے لئے تیار نہیں تھے، اب اس بارے میں خاصے فکرمند نظر آتے ہیں۔

ارباب مدارس کی عمومی سوچ میں اس تبدیلی کا اثر ہے کہ بہت سے دینی مدارس میں عصری علوم کے لئے نسبتاً زیادہ گنجائش پیدا کی جارہی ہے اور خود وفاق المدارس کے نصاب میں بھی اس حوالے سے کچھ تبدیلیاں ہوچکی ہیں۔ تاہم عصری علوم خصوصاً انگریزی کی اہمیت وضرورت کے احساس کے باوجود ایک بہت بڑا خطرہ جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ کہیں یہ دینی مدارس عصری علوم کی آمیزش کے شوق میں ایسی افراط وتفریط کا شکار نہ ہوجائیں کہ نہ یہ دینی مدارس رہیں نہ اسکول وکالج۔ کہیں یہاں کے فضلاء علوم اسلامیہ اور فنون عصریہ دونوں میں مہارت کی بجائے دونوں میں نیم پختگی کا شکار نہ ہوجائیں اور بیک وقت ''نیم ملا ونیم حکیم'' کا مصداق قرار نہ پائیں۔ دراصل یہی وہ اندیشہ تھا جس کی بناء پر ہمارے اکابر میں سے کئی حضرات عصری علوم کی ضرورت کو محسوس

کرتے ہوئے بھی مدارس دینیہ میں اس م ں سوط یم ے سے تیارنہ ہوئے اورانہوں نے مدارس کو خالص دینی علوم ہی کے لئے وقف رکھا۔ اس سوچ میں مشہور اصول پیش نظر تھا کہ ''نفع حاصل کرنے کی نسبت نقصان سے بچنا زیادہ ضروری ہے''۔

علاوہ ازیں تقسیم ہند سے قبل دینی مدارس نے جس ماحول میں جنم لیا تھا اس ماحول میں زمانے کا اصل چیلنج اصول دین کی حفاظت تھا جنہیں انگریزی استعمار پامال کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مدارس دینیہ نے اس چیلنج کا بخوبی مقابلہ کیا اور اب تک کررہے ہیں۔ دنیا میں اس وقت دین کے جتنے شعبے کام کررہے ہیں ان سب کو دینی مدارس ہی نے بنیاد فراہم کی ہے۔ اس لحاظ سے دینی مدارس کے موجودہ نظام اور نصاب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کے قدرے زیادہ امتزاج کی ضرورت کو اکابر نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی محسوس کرلیا تھا۔ کیوں کہ اب ایک اسلامی مملکت کے نظام کو سنبھالنے اور دعوت دین کو دنیا بھر میں عام کرنے کا نیا چیلنج بھی ان کے سامنے آچکا تھا۔

اس صورتحال میں اکابر کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کی جھلک آپ حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تحریر میں ملاحظہ کرسکتے ہیں:

> ''اگر ہمارے متقدمین اپنے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر منطق وفلسفہ اور ریاضی کی تعلیم کو نصاب کا ایک بڑا جزو بناسکتے ہیں تو ان کا اتباع آج اس میں نہیں کہ ہم اس وقت بھی وہی منسوخ شدہ سکے لے کر بازاروں میں پھریں، بلکہ وقت کی ضرورت کے مطابق انگریزی زبان اور فنونِ جدیدہ کو پڑھنا اور پڑھانا وہی درجہ رکھے گا جو اس زمانے میں فارسی زبان اور یونانی فلسفہ کا تھا''۔ [طلبۂ علم دین سے خطاب، ناشر ادارہ اسلامی لاہور]

حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ کی اس وسعت نظری کا نتیجہ ہے کہ آج دارالعلوم کراچی کا نصاب اسلامی علوم کے علاوہ عصری تعلیم کے لحاظ سے بھی کچھ خاص امتیازات رکھتا ہے۔ جہاں تک باقاعدہ ایک ایسا ادارہ بنانے کا تعلق ہے جہاں دینی علوم اور عصری تعلیم پر یکساں توجہ دے کر فضلاء کو بیک وقت عالم دین اور ماہر علوم عصریہ بنایا جائے تو اس سلسلے میں مختلف مقامات پر کئی تجربات ہوئے مگر کوئی تجربہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہوا، تاہم اسے بدقسمتی کہنا غلط ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو کام نازک بھی ہو اور پھر بنیادی تحفظات کے بغیر کیا جائے اس کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

دینی مدارس میں علوم عصریہ کی بقدر ضرورت مناسب آمیزش کا کام اس قدر نازک ہے کہ اس میدان میں غیر معمولی یکسوئی، سنجیدگی، وسعتِ فکر اور احتیاط سے کام کرنے والوں کے سوا ہما وشما کو اس کا اندازہ تک نہیں ہوسکتا اور

اچھے اچھے مخلص لوگ بھی اس ناکامی سے دوچار ہوتے دیکھے گئے۔ تبلیغی کالج کراچی اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کا حال سب کے سامنے ہے۔ بہرکیف ان ناکامیوں کے باوجود علماء کے ایک طبقے میں اس حوالے سے فکر ونظر کا سلسلہ تدریجاً آگے بڑھتا رہا جواب ایک خاص مربوط شکل اختیار کر چکا ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض علماء کرام کو اس معاملے پر ہمہ جہتی غور وفکر کی توفیق عطا فرمائی ہے اور ان کی سوچ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس بارے میں روایتی نقطۂ نظر سے ہٹ کر گہری بصیرت کے ساتھ اس کام کے جملہ تقاضوں کا احساس کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں گزشتہ دنوں روزنامہ اسلام میں محترم مولانا ابن الحسن عباسی کا دو قسطوں پر مشتمل ایک پرمغز مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا موصوف نے تقریباً ان تمام احتیاطی پہلوؤں کا تذکرہ کر دیا تھا جنہیں اس میدان میں پیش رفت کرنے سے قبل ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مولانا ابن الحسن عباسی صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں جو خلاصۂ مطلب بیان کیا تھا، اسے ایک بار پھر پڑھ لیجئے:

> ''ہماری گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ بلاشبہ دینی مدارس میں جدید عصری علوم اور موضوعات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں پیش رفت بھی ہو رہی ہے، لیکن اس پیش رفت میں ذکر کردہ پانچ باتوں کا خیال رکھا جائے۔ (اول) طلبہ کے دل ودماغ کو مرعوبیت سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو۔ (دوم) اسلام کی دائمی حقیقتوں سے متعلق فکر ونظر میں تبدیلی نہ آنے پائے۔ (سوم) اکابر واسلاف کے کام اور طریقے کی عظمت اور اہمیت برقرار رہے۔ (چہارم) جدیدیت میں دلچسپی بقدر ضرورت رکھی جائے اور (پنجم) مدرسہ کی محنتوں کا اصل مقصد اور ہدف نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ تب تو یہ پیش رفت مفید اور بارآور بنے گی اور امت کے سامنے اس کے اچھے ثمرات آئیں گے، بصورت دیگر یہ ناکام تجربات کی فہرست طویل کرنے کا ذریعہ بنے گی''۔

میری طرح شاید کوئی بھی شخص جو اس معاملے میں سنجیدہ ہو، مولانا کی بیان کردہ مذکورہ احتیاطوں کی اہمیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ جہاں بھی اس سلسلے کے تجربات میں ناکامی ہوئی ہے اس کے اسباب میں مذکورہ تمام نکات یا بعض نکات سے پہلوتہی ضرور کارفرما رہی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور چیز بہت اہم ہے جسے نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔ دراصل عصری علوم کی شمولیت کی ہوا کچھ اس طرح چل پڑی ہے کہ اکثر مدارس نے یہ سلسلہ کسی نہ کسی درجے میں شروع تو کر دیا ہے مگر بڑے بے ڈھب انداز میں۔ عموماً عصری مضامین کسی خاص ترتیب، لگن اور اہمیت کے بغیر پڑھائے جا رہے ہیں جس سے طلبہ کا

وقت اور مدارس کا سرمایہ ضائع ہو رہا ہے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ جن اداروں میں علوم دینیہ کے ساتھ عصریہ کی ترتیب اہمیت کے ساتھ بنائی جاتی ہے وہاں مجلس منتظمہ کے ارکان اور علوم عصریہ کے مدرسین میں دینی پختگی کی اہمیت کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ حتی کہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ریاضی اور انگریزی پڑھانے والے استاد فرائض و واجبات تک کے تارک اور علانیہ فسق و فجور کے عادی نظر آتے ہیں، ان میں بہت سوں کے عقائد و نظریات بھی درست نہیں ہوتے۔

ظاہر ہے ایسے آزاد خیال اساتذہ کے اثرات طلبہ کی شخصیات کو بے عملی پر اکسانے اور انہیں شعائر اسلام سے بے گانگی کی جانب راغب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر، ناسمجھی کی بات یہ ہے کہ ایسے اداروں کی انتظامیہ میں غیر پختہ یا نیم پختہ دینی سوچ کے حامل افراد کو شامل کر لیا جاتا ہے جس کی بسا اوقات ظاہری شکل و صورت بھی خلاف شرع ہوتی ہے۔ انہیں اس عذر کے تحت لے لیا جاتا ہے کہ ادارے کی بہتر کارکردگی کے لئے ایسے افراد کا انتظامیہ میں ہونا ناگزیر ہے اور باشرع افراد دستیاب نہ ہونے کے باعث ان پر انحصار کرنا مجبوری تصور کر لیا جاتا ہے۔ ایسے افراد سے آگے چل کر وہ فتنے پھیلتے ہیں جو ادارے کے اہداف و مقاصد اور دینی ماحول تک کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں۔

راقم کا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس میدان میں کام کرنے کے خواہاں افراد کو ایک بار اسلام آباد میں مری ہائی وے سترہ میل اسٹاپ پر واقع ''ادارہ علوم اسلامی'' کا دورہ ضرور کرنا چاہیے، اس لئے کہ میری معلومات کی حد تک یہ ادارہ ایسی تمام کمزوریوں سے پاک ہے، جن سے دینی و عصری کے امتزاج میں کسی افراط و تفریط کا خدشہ ہو۔ اس ادارے کے نظام، ماحول، نصاب اور طریق تدریس کو دیکھنے بھالنے کے بعد راقم پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ یہاں مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کی مذکورہ پانچوں احتیاطیں ملحوظ رکھی جا رہی ہیں۔ دارالعلوم کراچی کے اساتذہ و اکابر یہاں کے نظام تعلیم اور کارکردگی کی تعریف کر چکے ہیں۔ یہاں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ فرائض و واجبات، مسنون اعمال اور شعائر اسلامیہ کی پابندی کے اعتبار سے اساتذہ و طلبہ کی حالت قابل رشک محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً پنج وقتہ نمازوں سے قبل اور تہجد کے وقت ذکر و تلاوت اور نوافل کی پابندی کا ماحول ایک خانقاہ جیسا رنگ پیش کرتا ہے۔

ادارے کے بانی مولانا فیض الرحمٰن عثمانی جو کہ دارالعلوم کراچی کے فاضل جید عالم دین ہیں ان کا نقطۂ نظر اس سلسلے میں بہت واضح اور نہایت گہرا ہے، مولانا اس کام کے لئے جو سفارشات پیش کرتے ہیں وہ نصاب اور نظام دونوں سے متعلق ہیں اور ان کا نچوڑ ہفت روزہ ضرب مؤمن کی جلد ۱۰ کے شمارہ ۴۰، ۴۱ اور ۴۲ میں شائع ہو چکا ہے،

علاوہ ازیں مولانا موصوف کی تازہ تصنیف ''رہنمائے طلبہ'' اور ادارۂ علوم اسلامی کے پراسپیکٹس کا مطالعہ کرلے اس موضوع پر بہت مفید رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

قارئین، راقم کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ اس نازک ترین کام کو اہل علم خصوصاً ان علماء کی نگرانی اور مشاورت کے بغیر انجام دینے کی کوشش کرنا خطرناک ہوگا جو اس میدان میں ایک طویل سفر کر چکے ہیں۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس کٹھن راستے کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

اگر اس معاملے پر بار بار مشورے نہ ہوئے تو بہت سی بے احتیاطیاں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اب بعض حضرات عصری علوم کی ضرورت پر اس قدر زور دے رہے ہیں کہ ان کے بقول سائنس وٹیکنالوجی کے اعلیٰ مدارس بھی مدارس دینیہ میں طے ہوجانے چاہئیں اور ایک عالم کو ڈاکٹر اور انجینئر بھی ہونا چاہیے۔ یہ بعینہٖ وہ سوچ ہے جو اہل مغرب اور مغرب نواز حکمران ارباب مدارس میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جو کہ مدارس کی بنیاد سے انحراف کے مترادف ہے۔ اس بارے میں مولانا فیض الرحمٰن عثمانی فرماتے ہیں:

> ''یہ ناچیز موجودہ مدارس کے نصاب میں اس معنی میں کسی بڑی تبدیلی کا قائل نہیں کہ ان مدارس میں سائنسی علوم وفنون کے تخصص کا انتظام کیا جائے یا میڈیکل وانجینئرنگ کی تعلیم دی جائے یا موجودہ نصاب پڑھانے کے دوران ''ایف اے'' اور ''بی اے'' کے سرکاری امتحانات دلائے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ عمل دینی علوم میں رسوخ کے راستے میں یقینی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ ناچیز اس تبدیلی کو غیر صحت مند تبدیلی سمجھتا ہے اور خدشہ ہے کہ یہ عمل دینی علوم میں استعداد کو ناقابل یقین حد تک کمزور کردے گا''۔ (خطاب مولانا فیض الرحمٰن عثمانی قسط (۲)، ضرب مومن ج ۱۰، شمارہ ۴۱)

مولانا فیض الرحمٰن نے ادارۂ علوم اسلامی میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کے مناسب امتزاج کی جو ترتیب قائم کی ہے اس کے نتائج سامنے آنا شروع ہوگئے ہیں اور اس ادارے کے فضلاء دینی علوم میں رسوخ، عقائد و نظریات کی پختگی، اخلاق واعمال کی اصلاح اور عصری علوم کی استعداد کے حوالے سے نمایاں کارکردگی کے حامل پائے گئے ہیں۔

ادارۂ علوم اسلامی کے ترتیب کے علاوہ ملک کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الرشید کے اکابر نے گہری سوچ بچار اور طویل مشاورت کے بعد ایک اور ترتیب سے کام شروع کیا ہے جس کی طرف میں ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس ترتیب کے مطابق عصری علوم میں ممتاز کارکردگی کے حامل نوجوانوں پر خصوصی محنت کر کے انہیں کم وقت میں اسلامی علوم کا ماہر بنایا جاتا ہے۔ یہ شعبہ کلیۃ الشریعۃ کے نام سے سرگرم عمل ہے اور اب تک کے نتائج کے اعتبار

سے قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ شعبہ بہت جلد متقی، پرہیز گار، پرعزم اور بلند ہمت نوجوانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کردے گا جو عصری واسلامی علوم کے جامع ہونے کے باعث دور جدید کے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہوں گے اور علوم اسلامیہ کی اشاعت وحفاظت، دعوت دین، اسلامی صحافت اور دیگر اہم شعبوں میں قابل رشک کارنامے انجام دے سکیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ جو علماء کرام اپنے زمانۂ طالب علمی میں عصری علوم وفنون کی مطلوبہ استعداد حاصل نہیں کرسکے، ان کے لئے کیا ترتیب مناسب ہوگی۔ اس سلسلے میں ممکنہ حل یہ نظر آتا ہے کہ بڑے دینی مدارس مذکورہ احتیاطوں کے ساتھ اپنی نگرانی میں اسپیشل کورسز کے پروگرام شروع کریں جن میں علماء کرام کی مصروفیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان میں عصری علوم کی مطلوبہ صلاحیت پیدا کی جائے۔ خصوصاً اپنے کام کے لحاظ سے انہیں جس مضمون یا فن کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، اس پر خاص توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں جامعۃ الرشید نے سبقت لے جاتے ہوئے فضلاء مدارس کے لئے اسپیشل کورسز کے عنوان سے ایک جامع نظام وضع کیا ہے، جس میں دینی علوم میں تخصص کے ساتھ ساتھ صحافت، انگریزی اور کمپیوٹر میں بھی بہترین استعداد پیدا کی جاتی ہے اور تجربے سے اس کا مفید اور کامیاب ہونا ثابت ہوچکا ہے۔

ان تمام معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کے ساتھ عصری علوم کے اس قدر امتزاج کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جس سے زمانے کے نت نئے تقاضوں اور جدید چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ یہ استعداد خود فضلائے مدارس کے لئے عام زندگی کے معاملات کو بہتر انداز میں چلانے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

اب جہاں تک اس امتزاج کی ترتیب طے کرنے کا مسئلہ ہے تو اس کے لئے اس میدان میں کام کا تجربہ رکھنے والوں سے لازماً رہنمائی لی جائے۔ مولانا ابن الحسن عباسی اور مولانا فیض الرحمٰن عثمانی جیسے صاحب بصیرت حضرات اس سلسلے میں جن احتیاطوں کو ملحوظ رکھنے کی سفارش کررہے ہیں، انہیں نظر انداز نہ کیا جائے، جامعۃ الرشید کے اکابر کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے اور خودرائی کے ساتھ ایسے نت نئے تجربے کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے جن کی تہہ میں امت کے عمومی مفاد کی بجائے محض اپنے اداروں کی تشہیر کا جذبہ کارفرما ہو۔ ایسی انفرادیت یقیناً کسی دینی ادارے کے لئے حقیقی اور مستقل نیک نامی کا باعث نہیں بن سکتی، جس سے امت کو قرار واقعی فائدہ نہ ہوگا۔

☆☆☆